اسلام اور رواداری

تحریر: پروفیسر عبدالجبار شاکر

اسلامی فکری اور عقیدہ کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک رواداری بھی ہے۔ مذاہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو مختلف مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ نفرت ورقابت کے جذبات سے مملو دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ یہی عالم ہمیں تہذیبوں کی باہمی کشمکش میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ایک اور تضاد کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ مذاہب کی فطری تعلیم اخلاق ومحبت اور عفوودرگزر کی ہے مگر یہ نفرتیں اور تعصّبات، نسلی تفاوت اور طبقاتی کشمکش، مذہب کے نام پر کیوں کر پیدا کی جاتی ہیں؟ اس کا علمی جواب اور اس کی تاریخی وجوہ تو بہت سی بیان کی گئی ہیں مگر سادہ سی حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مذہب کی فکری پاکیزگی کو چھوڑ کر اور اس کی فطری تعلیمات سے روگردانی کر کے اپنی نفسی خواہشات، نفسی مفاخرت اور معاشی مفادات کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس سے احترام آدمیت کی بنیادیں گرنے لگتی ہیں، اور یوں اقوام وملل میں نسلی، لونی، گروہی اور مذہبی اختلافات سر اٹھانے لگتے ہیں اور یہی رجحان افراد اور اقوام میں عدم رواداری کے جذبات کو جنم دیتا ہے۔

تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو اس میں نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کے اختلافات اتنے نمایاں دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے باعث دنیا بہت سے فسادات کا شکار ہوئی ہے۔ ان تعصبات میں نسلی برتری نے انسانیت کو بدترین نتائج کے ساتھ دوچار کیا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ سفید رنگ کو عزت وعظمت کا اور کالے رنگ کو ذلت ونکبت کا معیار ٹھہرایا جائے۔ اکیسویں صدی کے اس جدید صنعتی ماحول میں بھی رنگوں کا یہ اختلاف ایک فتنے کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، پھر بعض مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان تعصبات نے معرکہ آرائی کی مختلف شکلیں اختیار کی ہوئی ہیں جن سے تہذیبوں کے درمیان ایک مستقل آویزش اور مخاصمت دکھائی دیتی ہے۔ معاشی مفادات نے ان تعصّبات کو مزید بڑھا دیا ہے۔ بعض مذاہب رنگ ونسل کے امتیازات کے ساتھ ساتھ ذات پات کے جھگڑے اور چھوت چھات کے واہمے میں بھی گرفتار ہیں۔ قدیم تہذیبوں کا تاریخی مطالعہ کریں تو اس میں انسانوں نے خود

انسانوں پر اتنے انسانیت سوز مظالم ڈھائے ہیں کہ جن کو پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رومی تہذیب میں رومۃ الکبریٰ کے بازاروں میں انسانوں کی بھیڑ بکریوں کی طرح خرید وفروخت ہوتی ہے۔ شہنشاہ اپنی تفریح طبع کیلئے ایسے اکھاڑے (Colosseum) تعمیر کرتے تھے کہ جن میں انسانوں کو بھوکے درندوں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا جوان کو آن واحد میں چیر پھاڑ دیتے تھے۔ اس دور میں غلاموں کو سزا دینے کے بہت خوفناک طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ معمولی غلطیوں پر بڑی بڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔ قبل اسلام تہذیبوں میں غلامی کو معیوب سمجھنے کے بجائے اسے حکمرانوں کی قوت اور شوکت کا نشان تصور کیا جاتا تھا۔ انسانیت کی تذلیل ایک فیشن کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ احترام اور رواداری کی اقدار کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ یہود اور نصاریٰ جیسے مذاہب کے ماننے والوں میں بھی جنگ وجدل اور کشت وخون کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ مابعد کی صدیوں میں تو خود ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں اور مسالک کے درمیان عدم رواداری کے ماحول نے انسانی اقدار کو تلپٹ کر رکھا تھا۔ یہ اسلام اور اس کی تہذیب کا کمال ہے کہ اس نے انسانیت کو غلامی اور عدم رواداری سے پیدا ہونے والے نتائج سے محفوظ کر کے تکریم انسانیت کا درس دیا۔

رواداری اسلامی تہذیب اور عقیدے کی نمایاں ترین خصوصیت میں سے ہے۔ لغوی اعتبار سے ''روا'' کے معنی کسی بات کو جائز سمجھنے کے ہیں اور ''داری'' کا لفظ داشتن مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی ''رکھنا'' کے ہیں۔ جہاں تک رواداری کے سماجی یا معاشرتی مفہوم کا تعلق ہے تو اصطلاح میں کسی جماعت، فریق، گروہ، ادارے یا حکومت کا جو کسی دوسرے فریق یا گروہ کی بات کو اصولاً یا اصلاً غلط سمجھتی ہے مگر ان کے مذہبی اور ثقافتی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں برداشت کرنا اور انہیں اپنی اقدار وروایات کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کی بخوشی اجازت دینا رواداری کہلاتا ہے۔ اختلاف رائے ایک فطری عمل ہے اور یہ مذہب ومعاشرت اور سیاست ومعیشت کے ہر میدان میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے مگر اس اختلاف رائے کو جو چیز ظلم اور درندگی بننے سے روکتی ہے وہ رواداری کا جذبہ ہے۔ انسان مدنی الطبع اور اس کا ایک سماجی وجود ہے۔ وہ شروع سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی باہمی معاشرت ایک تمدن کی بنیاد ڈالتی ہے اگر قوموں، ملکوں اور مذاہب کے درمیان رواداری کا کلچر پیدا نہ کیا جائے تو تمدن کو

دھچکا لگتا ہے اور دنیا ایک جہنم زار بن جاتی ہے۔

اسلامی تہذیب اور تمدن کا یہ امتیاز تاریخ کے ہر دور میں نمایاں رہا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ریاستوں میں بسنے والے دوسرے مذاہب اور نسلوں کے لوگوں کی مذہبی وثقافتی اقدار کا احترام کیا ہے اور ان کی تہذیب وثقافت پر عیب جوئی یا نکتہ چینی کو برائی تصور کیا ہے۔ اسلامی ریاست میں قوت اور طاقت رکھنے کے باوجود زبردستی کسی دوسرے کے عقیدے کو تبدیل کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔ یوں اسلامی ریاست میں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کی اقدار کا لحاظ رکھنا، وہ بنیادی قدر ہے جسے اسلام رواداری کا نام دیتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ پر توجہ دیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قدرت نے اس کائنات میں ہر نوع کے رزق کے دروازے کسی شخص پر بند نہیں کئے ہیں۔ خالق کائنات کے بخشے ہوئے دین فطرت کا انکار کرنے والے بھی اس کے رزق سے اسی طرح متمتع ہوتے ہیں جیسے اس کے حضور میں سجدہ ریز ہونے والے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انسانی حدود اور اخوت کے پیغام کو عام کیا ہے اور رنگ ونسل کے امتیازات میں لتھڑی ہوئی انسانیت کو یہ پیغام دیا:

﴿یأیها الناس اتقو ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللّٰه الذی تساء لون به والأرحام ان اللّٰه کان علیکم رقیبا﴾[النساء:۱]

ترجمہ: ''لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان دار سے پیدا کیا اور اس جان دار سے ایک جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی، کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

پھر ایک دوسرے مقام پر قرآن میں ارشاد ربانی ہے:

﴿یأیها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان أکرمکم عند اللّٰه أتقکم ان اللّٰه علیم خبیر﴾[الحجرات:۱۳]

ترجمہ: ''لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے

تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، اور اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، سب سے خبردار ہے۔"

قرآن مجید کی انہی تعلیمات کا فیضان تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک ایسے معاشرے اور ریاست کی تشکیل فرمائی کہ جس میں رواداری اور احترام آدمیت کی اقدار کو اجاگر کیا گیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں جس اسلامی معاشرے کی تشکیل کی اس میں مہاجرون اور انصار کے گروہوں نے ایک ایسی اخوت کا مظاہرہ کیا جو انسانی تاریخ میں مؤاخات کی بہترین مثال ہے۔ ابھی اسلامی ریاست کا رقبہ صرف چند مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسا دستور ریاست لکھوایا جس میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک واضح طریق درج تھا۔ شاید یہ تاریخ انسانی کا پہلا دستور تھا جسے کسی حکمران نے خود تحریر کروایا اور اس میں اپنی ریاست میں پائے جانے والے تمام مذاہب کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا۔ اگر اس دستور کی چون (۵۴) دفعات پر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں نصف کے قریب میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق وفرائض کا ذکر ہے۔ یہ رواداری کے کلچر کو فروغ دینے کی پہلی آئینی دستاویز ہے جیسے تاریخ عالم میں اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی جن سینتالیس بنیادی حقوق اور تعلیمات کا تذکرہ کیا ان میں بھی رنگ ونسل کے بتوں کے گرانے اور توڑنے کا ذکر ہے۔ خود قرآن مجید کی تعلیم بھی اپنے ماننے والوں اور اہل حکومت کیلئے یہ ہیں:

﴿یایھا الذین امنوا کونوا قوامین للّٰہ شھداء بالقسط ولا یجر منکم شنان قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتقوی﴾[المائدہ:۸]

ترجمہ: "کسی قوم کی دشمنی یا مخالفت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس سے انصاف نہ کرو، انصاف کرو کیونکہ یہی پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر امت مسلمہ کو ایک معتدل امت قرار دیتے ہوئے ان کی ذمہ داریوں پر توجہ دلائی گئی ہے:

﴿وکذلک جعلنکم أمة وسطالتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول

علیکم شھیدا﴾[البقرۃ:۱۴۳]

ترجمہ: ''اوراسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنواور رسول تم پر گواہی دیں۔''

اسلام جہاں رواداری، باہمی احترام اور تکریم انسانیت کے کلچر کو رواج دیتا ہے وہیں انتہا پسندی کی نفی بھی کرتا ہے۔ یہ اصطلاح ایک مدت سے عالمی میڈیا مذہبی یا سیاسی گروہوں کیلئے استعمال کر رہا ہے۔ اسلام اپنے تہذیبی رویوں کے حوالے سے اعتدال کا نام ہے، افراط وتفریط کا نہیں۔ اسی لئے ہمیں (خیر الأمور اوسطھا) کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید انتہا پسندی کے مفہوم میں ''غلو'' کی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے جو اپنے عمومی معانی میں اعتدال کی حدود سے تجاوز کا نام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یا أھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللّٰہ الا الحق.....﴾

[النساء:۱۷۱]

ترجمہ: ''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔''

اسلام اور انتہا پسندی دو متضاد رویے ہیں۔ اگر انتہا پسندی کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ عام طور پر منحرف گروہوں میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام کسی زیر زمین سرگرمی کا قائل نہیں ہے۔ اس کا نصب العین واضح، مقاصد متعین اور اہداف نمایاں ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں مذہبی رواداری پر اس درجہ توجہ دی گئی ہے اور رسول کریم ﷺ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے اس کی اتنی روشن مثالیں قائم کیں جن کے تذکرے کیلئے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔ اس سلسلے میں اسلام صرف رواداری کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کلچر کو پروان چڑھانے کیلئے جن بنیادی لوازم کی ضرورت ہے، ان کو بھی نظری اور عملی اعتبار سے واضح کرتا ہے۔ عدل اجتماعی اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے اور یہ انسانی احترام کی سربلندی کیلئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اسلام تو اپنے دشمنوں تک سے انصاف بلکہ احسان کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام عدم رواداری کی زنجیروں

میں جکڑی ہوئی انسانیت کے درمیان بہت تیزی کے ساتھ پھیلا اور پہلی صدی ہجری کے اختتام تک یہ تین براعظموں کے بیشتر علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ رسول ﷺ نے رواداری کی جو روشن مثالیں قائم کیں اس میں فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے طرز عمل کو سب سے بڑی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں بیاسی غزوات وسرایا وقوع پذیر ہوئے جن میں چھ ہزار پانچ سو چونسٹھ دشمنوں کو قیدی بنایا گیا مگر آپ ﷺ نے چھ ہزار تین سو سنتالیس (6347) کو فوری طور پر رہا کر دیا۔ یہ آپ ﷺ کی رواداری کا پہلو ہی تھا کہ آپ ﷺ نے غزوہ بدر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دی اور فدیہ بلکہ اس سے بھی کم تر شرائط پر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ یہ رواداری کا ایک عجیب منظر تھا کہ قیدی گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے اور مجاہدین ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ مجاہد خود کھجوروں اور جو پر گزر بسر کر رہے تھے لیکن قیدیوں کو گندم کی روٹی کھلا رہے تھے۔ رسول ﷺ پر کل سترہ قاتلانہ حملے یا خوراک میں زہر ملا کر ہلاک کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان سازشوں کے منکشف ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیا۔ طائف میں آپ ﷺ کے ساتھ جو بدترین سلوک روا رکھا گیا اس پر جذبات نہ رکھنے والے فرشتوں کی طبیعتیں بھی پسیج گئیں لیکن آپ ﷺ نے ان کیلئے بددعا تک کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ غزوۂ بنو مصطلق میں عبداللہ بن ابی بن سلول کے طرز عمل سے کون آگاہ نہیں ہے، اس کے گستاخانہ کلمات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی گردن مارنے کی اجازت چاہی تو پیغمبر رحمت ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا ہوا تو لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔'' اس شخص کے جرائم اس قدر واضح تھے کہ اس کے اپنے بیٹے نے باپ کو خود قتل کرنے کی اجازت طلب کی لیکن آپ ﷺ نے رواداری کے جذبات کی وہ مثال قائم کر دی کہ تاریخ اس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔ ۹ ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فلس نامی ایک بت توڑنے کا حکم دیا۔ واپسی پر وہ بہت سے قیدیوں کے ساتھ لوٹے تو ان میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھی، گو کہ اس کا بھائی عدی بھاگ کر شام نکل گیا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ جاننے کے بعد کہ یہ عرب کے مشہور سخی کی بیٹی ہے، اس کا اکرام اور استقبال کیا۔ اس منظر سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے اپنے بھائی کو فہمائش کے طور پر پیغام بھیجا کہ تمہیں اس عظیم شخصیت کی رواداری اور اخلاقی عظمت کا احساس نہیں اور اگر تمہیں علم ہوتا تو تم

بھاگنے کی بجائے اس کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ چنانچہ عدی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور دولت اسلام سے فیض یاب ہو گئے۔

رواداری کا یہ کلچر خلافت راشدہ میں بھی جاری وساری رہا اور اس کی روشن مثالیں قائم ہوئیں۔ بیت المقدس کی فتح پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طرز عمل ان کی ایک روشن مثال ہے۔عیسائی دنیا اپنے ساتھ اس حسن سلوک کی گرویدگی سے انکار نہیں کر سکی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شہادت قبول کر لی مگر مٹھی بھر باغیوں کی سرکوبی کی بجائے مدینہ کی پاکیزہ فضا کو برقرار رکھنے کو اپنی زندگی پر ترجیح دی۔

برصغیر میں محمد بن قاسم کے حملوں کے نتیجے میں جو پہلی اسلامی سلطنت قائم ہوئی اس میں ہندوؤں کے ساتھ ان کی رواداری کے باعث ہزاروں ہندو مسلمان ہو گئے اور جو ہندو رہے، انہوں نے ان کی اخلاقی عظمت کو یوں خراج پیش کیا کہ ان کی شخصیت کے بت بنائے، اپنے مندروں میں سجایا اور اس کی پوجا پاٹ بھی کی۔ رواداری کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات اور صدر اول کی ان گنت مثالیں اپنی جگہ، خود مسلم حکومتوں اور بادشاہوں نے بھی رواداری کی عظیم مثالیں قائم کی ہیں۔ صلیبی جنگوں کے حوالے سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے طرز عمل کو انگریز مؤرخ ابھی تک خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ برصغیر میں مغل حکمرانوں کی رواداری ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ان کی سلطنت میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے اور مناصب عطا کئے گئے۔ اورنگزیب عالمگیر جس کے بارے میں بعض متعصب مؤرخین نے بہت نکتہ چینی کی ہے، اس نے امرتسر گردوارہ دربار صاحب کی تعمیر کیلئے خود زمین پیش کی اور پیش نظر رہے کہ اس دربار صاحب کا سنگ افتتاح مشہور صوفی بزرگ میاں میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا۔ رواداری کا یہ درس صوفیائے کرام کی تعلیمات سے ملتا ہے جن کے ہاتھوں لاکھوں غیر مسلموں نے اسلام کی دولت قبول کی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد کبھی پندرہ سے بیس فی صد سے زیادہ نہیں رہی لیکن یہ ان کی رواداری کا اثر اور فیض تھا کہ انہوں نے ایک ہزار سال تک کامیاب حکومت کی ہے۔ یہود جیسی متعصب قوم بھی مسلمانوں کے اس اقدام کی معترف ہے کہ تاریخ میں انہیں سب سے زیادہ پناہ اور شفقت مسلمانوں کے عہد حکومت میں میسر آئی۔آج بھی دنیا کی ساٹھ کے قریب اسلامی مملکتوں میں غیر مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کا مثالی رویہ اختیار کیا جا رہا ہے وہ تاریخ عالم میں اسلامی رواداری کی عظمت کی دلیل کی حیثیت

رکھتا ہے۔ پاکستانی عدلیہ میں کارنیلیس، دراب پٹیل اور رانا بھگوان داس عیسائی، پارسی اور ہندو ہوتے ہوئے بھی اسلامی ملک کی عدالت میں اپنے فرائض ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ عالم میں اس نوع کی رواداری کی مثالوں کا ملنا مشکل اور محال ہے۔

عالمی منظر نامے کو دیکھیں یا پھر اپنے ہی وطن کے بام و در میں جھانکیں تو عدم رواداری کا آسیبی ماحول چاروں جانب چھایا دکھائی دیتا ہے۔ عالمی دانشوروں نے اس ماحول سے چھٹکارا پانے کیلئے متعدد عالمی سطح پر ادارے ترتیب دیے ہیں، جن میں اقوام متحدہ اور عالمی عدالت انصاف نمایاں ہیں۔ عالمی خبر نامے کے غربال سے ہر روز چھن چھن کر جو خبریں ہماری سماعتوں کو مسموم اور پراگندہ کرتی ہیں، وہ سب عدم رواداری کے باعث جنم لیتی ہیں۔ کیا عالمی دانشور اس شعور سے محروم ہو چکے ہیں کہ آج انسانیت اس عدم رواداری کے باعث کس جہنم زار میں جل بھن رہی ہے۔ کیا اس کیلئے پھر سے کسی تازہ نظریہ معاہدہ عمرانی کی ضرورت ہے کہ اقوام عالم انصاف اور راستی کی بنیاد پر کمزور قوموں کو جینے کا حق بخشیں۔ اس موقع پر مسلم اقوام اور ممالک کو بھی اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اخلاقی سطح پر اس رواداری کے کلچر سے تغافل نہ کریں کہ جو ان کی تہذیب کا ایک نمایاں امتیاز رہا ہے۔ اس سلسلے میں ''قل یااھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم'' کے مصداق بین المذہبی اور بین التہذیبی مکالمے کو بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ کو عالمی اور ملکی عدم رواداری کے کلچر کو ختم کرنے میں مثبت کردار انجام دینا چاہیے۔ ہمارے دینی مدارس میں فقه المقارن کو ایک متعین مقصد کے بطور پڑھایا جانا چاہیے تاکہ بین المسلمین ہم آہنگی اور اتحاد کے مقصد کو پورا کیا جا سکے۔ اسلامی ممالک کو جہالت اور غربت کے خلاف مستقل جہاد کرنا چاہیے کیونکہ غربت خود ایک بیماری اور جہالت ہر بیماری کی ماں ہے۔ اسلامی ممالک کو عدل اجتماعی کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اپنی ریاستوں میں فلاحی اور رفاہی سرگرمیوں کو فروغ دینا چاہیے۔ مذہبی اور سیاسی گروہوں کو رواداری اور برداشت کی اقدار کا اظہار کرنا چاہیے، اپنے نصاب تعلیم کو اپنی روح تہذیب اور روح عصر سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ یہی وہ راستہ ہے جو نشان راہ بھی ہے اور خود منزل بھی ہے۔